© rasailojaraid.com

مفردات القرآن : ایک مطالعہ۔ فکر و نظر علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء، ۳۳/۱، ص ۱۳۔۳۶

۴۹۔

۵۰۔ حکمت قرآن، ایک مطالعہ : ابو سفیان اصلاحی، مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ، ۲۱/۱۔۲، ص ۶۷۔۷۸

۵۱۔ لفظ حکمت، پر تفصیلی بحث کیلئے دیکھئے : ؛ مفردات القرآن، ۳۴۔۳۸

۵۲۔ تدبر قرآن، ۱/ ۲۹۷

۵۳۔ قرآنی مقالات (ناشر) ادارہ علوم القرآن، سر سید نگر، علیگڑھ، طبع اول، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۵۔۱۳۴

۵۴۔ مفردات القرآن، ص ۱۱۔۱۲

۵۵۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، طبع اول، تاج کمپنی، دہلی۔ ۱۹۸۹ء، ۸/ ۱۲۰۔۱۲۱

۵۶۔ دیوان طرفہ بن العبد، دار صادر، بیروت، ۱۹۶۱ء، ص ۹۰

۵۷۔ انیس الجلساء فی شرح دیوان الخنساء (تحقیق و شرح : الاب لویس شیخو الیسوعی) المطبعۃ الکاثولیکیۃ للآباء، الیسوعیین ۱۸۹۶ء، ص ۲۴۳

۵۸۔ تدبر قرآن، ۱/ ۱۳۔۱۴

۵۹۔ ایضاً، ۱/ ۳۴۱

۶۰۔ وضاحت کے لئے دیکھئے ایضا، ۱/ ۳۴۱۔۳۴۳

۶۱۔ ایضاً، ۱/ ۳۵۲

۶۲۔ ایضاً، ۱/ ۳۵۴

۶۳۔ ایضاً، ۱/ ۳۶۰

۶۴۔ ایضاً، ۱/ ۵۸۶

۶۵۔ دیوان الحماسہ، المکتبہ الرحیمیہ، دیوبند، یوپی، ہند، ص ۱۹۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۶۶۔ تدبر قرآن، ۱/ ۵۵۷

۶۷۔ ایضاً، ۱/ ۱۳۲

۶۸۔ ایضاً، ۱/ ۱۳۲

۶۹۔ ایضاً، ۳/ ۲۶۶

۷۰۔ ایضاً، ۴/ ۴۷۶۔۴۷۸

۷۱۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، طبع اول، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۰ء، ۸/ ۳۱۵

۷۲۔ دیوان الحماسہ، ص ۱۴۱

۷۳۔ مفردات القرآن، ص ۵۸

۷۴۔ تدبر قرآن، ۸/ ۳۱۶

۷۵۔ ایضاً، ۸/ ۶۳۲

۷۶۔ ایضاً، ۸/ ۶۳۲

۷۷۔ تفسیر نظام القرآن، حمید الدین فراہی، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۴۸۵۔۵۰۴

۷۸۔ تدبر قرآن، ۱/ ۶۲

۷۹۔ ایضاً، ۱/ ۶۰

۸۰۔ ایضاً، ۱/ ۷۶

۸۱۔ ایضاً، ۱/ ۹۸۔۹۹

۸۲۔ ایضاً، ۱/ ۱۱۴۔۱۱۵

۸۳۔ ایضاً، ۱/ ۵۷۴

۸۴۔ ایضاً، ۱/ ۸۱۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسالیب قرآن- تدبر قرآن کی روشنی میں

محمد سعود عالم قاسمی

قرآن کریم فصیح وبلیغ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، قرآن کریم اپنے اسلوب بیان اور طرز ادا میں منفرد علمی شاہکار ہے۔ اور یہی اس کا بڑا اعجاز بھی ہے۔ جس کی مثال پیش کرنے سے ہر دور کے انسان عاجز رہے، جو شخص قرآن کریم کو پڑھنا، سمجھنا اور اس کے معانی و مطالب میں غور و فکر کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن کی زبان سے واقفیت اور اس کی لطافتوں سے آگہی حاصل کرے۔ اور اس کے لیے زبان کا صحیح ذوق ہونا ازحد ضروری ہے، مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول :

> "اس درجے و مرتبے کے کلام کے زور و اثر اور اس کی خوبیوں اور لطافتوں کا اگر کوئی شخص اندازہ کرنا چاہے تو یہ کام ظاہر ہے کہ وہ اس کے ترجموں، اس کی تفسیر اور اس کی لغتوں کے ذریعہ نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے لیے اس کو اس زبان کا ذوق پیدا کرنا پڑیگا جس میں وہ کلام ہے۔" (۱)

پھر اس زبان سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے آج کی مروجہ عربی زبان کا جاننا کافی نہیں بلکہ نزول قرآن کے وقت کی زبان کا جاننا ضروری ہے، ہر چند کہ قرآن کی زبان عربی ہے وہی عربی جو آج کل بولی اور سمجھی جاتی ہے، پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے، مگر قرآن کا جو رنگ و آہنگ اور اسلوب ہے وہ اتنا ٹکسالی ہے کہ مروجہ زبان سے یکسر منفرد ہے۔ اس سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے جاہلی ادبا، شعراء اور خطبا کے کلام سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس پہلو پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"قرآن مجید جس زبان میں اترا ہے وہ نہ تو حریری و متنبی کی زبان ہے نہ مصر و شام کے اخبارات و رسائل کی۔ بلکہ وہ اس ٹکسالی زبان میں ہے جو امرالقیس، عمرو بن کلثوم، زہیر اور لبید جیسے شعراء اور قیس بن ساعدہ جیسے بلند پایہ خطیبوں کے ہاں ملتی ہے، اس وجہ سے جو شخص قرآن کے ایجاز و اعجاز کا اندازہ کرنا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دور جاہلیت کے شعراء و ادباء کے کلام کے محاسن و معائب کے سمجھنے کا ذوق پیدا کرے، اس کے بغیر کوئی شخص نہ تو یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن عربی زبان کے محاسن کا کیسا کامل نمونہ ہے اور نہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اندر وہ کیا سحر ہے جس نے تمام فصیحوں اور بلیغوں کو ہمیشہ کے لیے عاجز و درماندہ کر دیا۔"(۲)

بیسویں صدی کے نصف آخر میں قرآن مجید کی جو اردو تفسیریں لکھی گئیں ان میں تفسیر تدبر قرآن سورتوں اور آیات میں ربط و تناسب، نظم کلام کی تشریح اور زبان و ادب کی خصوصی رعایت کی وجہ سے ممتاز ہے۔ اس کے مولف مولانا امین احسن اصلاحی (۱۹۰۳ـ۱۹۹۷) نے ممتاز عالم دین اور عربی و عبرانی کے عالم مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تعلیم و تربیت میں اپنے تفسیری ذوق کی آبیاری کی تھی۔ تدبر قرآن کی اساس بھی مولانا فراہی کے تفسیری افکار پر قائم ہے بقول مولانا اصلاحی :

"مجھے بڑا فخر ہوتا اگر میں یہ دعوی کر سکتا کہ اس کتاب میں جو کچھ بھی ہے استاذ مرحوم کا ہی افادہ ہے، اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے، لیکن میں دعوی کرنے میں صرف اس لیے احتیاط کرتا ہوں کہ مبادا میری کوئی غلطی ان کی طرف منسوب ہو جائے، مولانا سے میرے استفادہ کی شکل یہ نہیں رہی ہے کہ ہر آیت سے متعلق یقین کے ساتھ ان کی رائے میرے علم میں آگئی ہو بلکہ میں نے ان سے قرآن کریم پر غور کرنے کے اصول سیکھے ہیں اور خود ان کی رہنمائی میں پورے پانچ سال ان اصولوں کا تجربہ کرنے میں بسر کیے ہیں پھر انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر آج تک کام کرتا رہا ہوں۔"(۳)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کریم کی تفسیر و تشریح کا جو نہج مولانا فراہی نے متعین کیا ہے اس کی تفصیل تدبر قرآن ہے۔ مولانا اصلاحی نے تفسیر قرآن کے لیے دو قسم کے وسیلوں کو بطور ماخذ قبول کیا ہے اول داخلی وسائل جن میں قرآن پاک کی زبان، قرآن کا نظم اور قرآن کے نظائر و شواہد کو اہمیت دی ہے۔ دوسرے خارجی وسائل مثلاً حدیث، تاریخ، سابق آسمانی صحیفے اور تفسیر کی کتابیں۔ مولانا اصلاحی نے اگرچہ خارجی وسائل سے بھی تدبر قرآن میں استفادہ کیا ہے مگر ان کے نزدیک ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ ان کے اصلی مآخذ اولین وسائل ہی ہیں اور یہی تین چیزیں یعنی قرآن کی زبان، نظم، اور نظائر و شواہد تدبر قرآن میں غالب شکل میں نظر آتی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا اصلاحی نے عربی زبان و ادب کی نزاکتوں، نحوی و صرفی قاعدوں، فصحائے عرب کے استعمالات، شعراء جاہلیت کے اشعار اور محاوروں سے استفادہ کر کے قرآن کے اسلوب بیان اور انداز کلام پر غور کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ اہمیت سے خالی نہیں۔ اس موضوع پر زمخشری کی الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل سے لیکر ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمان بنت الشاطی کی التفسیر البیانی للقرآن الکریم تک بہت سی بیش قیمت تفسیریں دستیاب ہیں مگر اردو میں ایسی تفسیریں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔

آئندہ صفحات میں بعض ان اسالیب کے مطالعہ کی کوشش کی گئی ہے جن کو مولانا اصلاحی نے بطور خاص موضوع سخن بنایا ہے۔

حذف : قرآن کریم کے اسلوب بیان میں "حذف" خصوصی توجہ کا طالب ہے، قرآن کا یہ اسلوب عربی ادب کے عام اسلوب سے الگ نہیں ہے بلکہ وہاں بھی ادبا اور شعراء کے کلام میں حذف کا استعمال ملتا ہے۔ جب کوئی شے حذف کی جاتی ہے تو کوئی قرینہ وہاں ایسا موجود ہوتا ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے۔ قرآن کریم میں حذف کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ کبھی تو مبتدا یا خبر، کبھی شرط یا جواب شرط حذف ہوتا ہے کبھی معطوف حذف ہوتا ہے کبھی فعل محذوف ہوتا ہے اور کبھی لفظ یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حرف محذوف ہوتا ہے۔

جہاں کہیں یہ حذف پایا جاتا ہے صاحب تدبر قرآن نے ان مقامات کو کھولا ہے اور حذف کی حکمت وبلاغت پر روشنی ڈالی ہے، مثلاً دو مقابل اجزا میں بعض کے حذف کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:

"دوسری قابل غور چیز آیت من کان یرید ثواب الدنیا (النساء: ۱۳۴) میں حذف کا اسلوب ہے، ہم پیچھے کسی مقام پر اشارہ کر آئے ہیں کہ عربی کلام میں دو متقابل اجزا میں سے بعض اجزا کو اس طرح حذف کر دیتے ہیں کہ مذکور جزو، محذوف کی طرف خود اشارہ کر دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس آیت کے محذوفات کھول دیئے جائیں تو تالیف کلام یہ ہو گی "من کان یرید ثواب الدنیا فعند اللّٰہ ثواب الدنیا ومن کان یرید ثواب الاخرۃ فعند اللّٰہ ثواب الدنیا والاخرۃ۔ پہلے میں فعند اللّٰہ ثواب الدنیا کو حذف کر دیا اور دوسرے میں سے من کان یرید ثواب الآخرۃ کو۔ اس حذف کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، کہ مذکور ٹکڑے محذوف ٹکڑوں کی نشاندہی خود کر رہے ہیں۔"(۴)

ایک اور مثال جواب شرط کے محذوف ہونے کی ملاحظہ ہو، سورہ سبا کی آیت ولو تری اذ الظالمون موقوفون عند ربھم (سبا: ۳۱) کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب تدبر قرآن رقم طراز ہیں:

"جواب شرط یہاں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق محذوف ہے، حذف کا یہ طریقہ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں صورت حال تعبیر و تصویر سے ماورا ہو، مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ شامت زدہ لوگ قرآن اور اس کے بعد آنے والی قیامت کا نہایت جسارت سے انکار کر رہے ہیں لیکن کہیں تم ان کی اس حالت کو دیکھ پاتے جبکہ یہ اپنے رب کے حضور میں کھڑے کیے جائیں گے تو...... اس "تو" کے بعد اس منظر کو حذف کر دیا ہے جس سے یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات نکلی کہ اس کی ہولناکی تعبیر و تصویر کے حدود سے باہر ہے۔" (۵)

محذوفات کو کھول کر بیان کرنے کی مولانا اصلاحی نے جو کوشش کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کا یہ اسلوب اردو میں رائج نہیں ہے اس لیے اردو میں آیات کی تفسیر کرتے ہوئے محذوفات کو کھولنا مناسب اور ضروری ہے۔ چنانچہ سورہ الانعام کی آیت وما من دابة فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیه الا امم امثالکم (الانعام: ۳۸) کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اس ٹکڑے میں حذف کا وہی اصول ملحوظ ہے جو سورہ نساء کی آیت: ۱۳۴ میں ہے یعنی جملہ میں مقابل کے بعض الفاظ حذف ہو گئے ہیں اس لیے کہ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا ہے۔ مثلاً جملہ کے پہلے حصہ میں فی الارض کا لفظ ہے۔ تو دوسرے حصہ میں فی السماء کا لفظ حذف ہو گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے حصہ میں یطیر بجناحیه کے الفاظ ہیں تو پہلے حصہ میں تدب علی رجلیها یا علی ارجلها کے الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ فصیح عربی میں اس طرح کا حذف معروف ہے لیکن اردو میں یہ اسلوب نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے مواقع میں محذوف کو کھول دینا زیادہ بہتر ہے۔" (۶)

غالباً یہ بات بے محل نہ ہو گی کہ مولانا اصلاحی نے جہاں جن الفاظ کو محذوف بتایا ہے دوسرے مفسرین بھی اسے تسلیم کریں ضروری نہیں۔ محذوف ماننا اور اس کے الفاظ کا تعین کرنا اجتہادی اور تفسیری امر ہے۔ اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ چنانچہ سورہ الحج کی آیت ان الذین کفرو یصدون عن سبیل اللّٰہ والمسجد الحرام (الحج: ۲۵) میں مولانا اصلاحی نے فقد ظلموا ظلما کبیرا محذوف بطور خبر مانا ہے۔ جبکہ ان کے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ نے آیت کے ابتدائی ٹکڑے کو بطور تمہید مان کر اگلے ٹکڑے ومن یرد فیه بالحاد کو مبتدا قرار دیا ہے۔ (۷) اس صورت میں صرف تالیف کلام کی نوعیت کو سمجھنے کی ضرورت ہو گی نہ کہ محذوف ماننے کی۔

التفات: قرآن کا اسلوب خطیبوں کے خطاب کی طرح اپنے اندر مخاطب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مختلف گروہوں کی نفسیات و خیالات کی مناسبت سے تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ ایک ہی جملہ کے پہلے حصہ میں اگر خطاب متکلم کا ہوتا ہے تو دوسرے حصہ میں غائب یا حاضر سے بدل جاتا ہے ایسا ہی اس کے برعکس ہوتا ہے اس صنعت کلام کو التفات کہا جاتا ہے جو ہر فصیح و بلیغ خطیب کے یہاں ملتا ہے۔ قرآن کریم میں التفات کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ التفات کا ایک فائدہ تنوع ہے تو دوسرا فائدہ معنویت کی نئی جہت کی طرف اشارہ بھی ہے۔ مولانا اصلاحی نے تدبر قرآن میں ان مقامات کی حکمت کو بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے جہاں التفات پایا جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورہ النحل کی آیت :اتی امراللّٰہ فلا تستعجلوہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس آیت میں اسلوب بیان کا یہ فرق بھی ملحوظ رہے کہ فلا تستعجلوہ میں براہ راست ان کو خطاب کیا گیا ہے لیکن عما یشرکون میں خطاب کے بجائے غائب کا صیغہ آیا ہے۔ اس میں بلاغت یہ ہے کہ پہلے ٹکڑے میں تہدید و وعید ہے جس کے لیے خطاب ہی کا اسلوب زیادہ موزوں ہے اور اس دوسرے ٹکڑے میں کراہت و نفرت کا اظہار ہے جس کے لیے غائب کا صیغہ زیادہ مناسب تھا۔"(۸)

سورہ البقرہ کی آیت :۲۸۵ آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون الخ کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے:

"لانفرق بین احد من رسلہ... اس میں یکایک اسلوب کی جو تبدیلی ہوئی ہے یعنی بات غائب کے صیغہ سے نکل کر جو متکلم کے صیغہ میں آگئی ہے، یہ دھیان میں رکھنے کی ہے اور اوپر کے ٹکڑے میں بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہی گئی ہے لیکن یہ جملہ براہ راست امت کی طرف سے اعتراف و اظہار کی شکل میں نمایاں ہوا ہے، اس میں بلاغت کا یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اوپر کے ٹکڑے میں مسلمانوں کا جو عقیدہ بیان ہوا ہے پوری امت اس کا اقرار و اظہار کرتی ہے کہ ہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ کے رسولوں کے باب میں کسی تعصب میں گرفتار نہیں ہیں۔"(۹)

البقرہ کی دوسری آیت :۱۷۷۔ لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب کی تفسیر میں لکھا ہے :

"والموفون بعهدهم میں دفعتاً اسلوب کلام بدل گیا ہے۔ اوپر ایمان انفاق نماز اور زکوٰۃ کا ذکر فعل کی شکل میں آیا تھا الموفون کا عطف تو انہی پر ہے لیکن یہ اسم فاعل اور صفت کی صورت میں ہے پھر آگے الصابرین فی الباساء آرہا ہے جو ہے تو صفت کی صورت میں لیکن موفون پر معطوف ہونے کے باجود صابرون کے بجائے صابرین یعنی حالت نصب میں ہو گیا ہے، اسلوب کا یہ ردوبدل صرف تنوع کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ معنوی فوائد بھی ہیں۔"(۱۰)

مجانست : قرآن کریم میں بعض الفاظ ایسے بھی استعمال کیے گئے ہیں جو دوسرے الفاظ سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے آئے ہیں اور ان کی معنویت اپنے مقابل ہی کے الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔ عربی زبان میں یہ اسلوب بھی معروف ہے۔ اور اسے ہم مجانست سے تعبیر کرتے ہیں۔ مولانا اصلاحی نے اپنی تفسیر میں اس کی بعض مثالیں پیش کی ہیں۔ سورہ البقرہ کی آیت :۱۹۳۔ فان انتھوا فلا عدوان الا علی الظالمین کی تشریح میں لکھا ہے :

"انتھوا کا مفہوم ہمارے نزدیک وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ عدوان کے اصلی معنی تو تعدی اور زیادتی کے ہیں لیکن یہ لفظ یہاں مجرد اقدام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں کبھی کبھی بعض الفاظ محض مجانست و ہم آہنگی کے لیے استعمال ہو جاتے ہیں۔ ان کا مفہوم موقع و محل سے متعین ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "دناّھم کما دانوا" ہم نے ان کو بدلہ دیا جیسا کہ انھوں نے ہمارے ساتھ کیا۔ ظاہر ہے کہ یہاں دانو محض دنا کی مشابہت کی وجہ سے لایا گیا ہے۔ ورنہ موقع یہاں فعلوا یا اس کے ہم معنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی لفظ کا ہے۔ یا قرآن میں جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا (برائی کا بدلہ اسی کے مانند برائی ہے) ہر شخص جانتا ہے کہ کسی برائی کا بدلہ کوئی برائی نہیں ہے لیکن محض سابق لفظ کی ہم آہنگی کی وجہ سے جرم کے ساتھ اس کی سزا کو بھی سیئہ سے تعبیر کر دیا۔ اسی طرح آگے والی آیت میں ہے: فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ۔ اس آیت میں کسی کی زیادتی کے جواب میں جو اقدام کیا جائے اس کو بھی اعتدا کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ حالانکہ یہ معنی میں محض اقدام کے ہے۔ صرف اپنے ماسبق کے ساتھ ہم آہنگی کی وجہ سے اس شکل میں استعمال ہوا ہے۔"(۱۱)

سوالیہ اسلوب: قرآن میں مخاطب کے دل و دماغ میں کلام الٰہی کو جاگزیں کرنے، اس کی حقانیت کو واضح کرنے اور مخاطب پر حجت تمام کرنے کے لیے ایجابی و سلبی گفتگو کے علاوہ سوالیہ اسلوب بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اس سوالیہ اسلوب میں کہیں تو نفی کا معنی مضمر ہے اور کہیں استفہام کا۔ اس سے کلام میں زور اور استدلالی قوت کی شان پیدا ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ مولانا اصلاحی نے اس اسلوب کلام کی اہمیت محسوس کی ہے۔ سورہ النمل کی آیت: ۶۰ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس آیت اور اس کے بعد کی آیات کے صحیح زور کو سمجھنے کے لیے عربیت کے اس اسلوب کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جس کی طرف ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اشارہ کرتے آئے ہیں کہ اس قسم کے سوالیہ جملوں میں مقصود استفہام اور جواب نہیں ہوتا بلکہ افحام اتمام حجت اور جزر و تنبیہ ہوتا ہے، متکلم پورے زور بیان کے ساتھ سوالیہ انداز میں حقائق کو پیش کرتا جاتا ہے اور مخاطب کی طرف کسی جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔"(۱۲)

سوالیہ انداز بیان مختلف الفاظ کے حوالوں سے اختیار کیا گیا ہے، ان میں سے ایک "ھل" ہے۔ بعض مفسرین نے اس کو "قد" کے معنی میں لیا ہے۔ یعنی استفہام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بمعنی تحقیق مگر مولانا اصلاحی اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ سورہ الدھر کی پہلی آیت
ھل اتی علی الانسان حین من الدھر کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ھل کے معنی مفسرین نے استفہام کے بجائے عام طور پر قد کے لیے ہیں، لیکن کلام عرب میں اس معنی کے لیے مجھے کوئی نظیر نہیں ملی، بعض مثالیں جو اس معنی کے شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہیں ان پر میں نے غور کر لیا ہے۔ میرے نزدیک ان میں بھی "ھل" استفہام ہی کے لیے ہے۔ البتہ استفہام جس طرح ہماری زبان میں مختلف معانی کے لیے آتا ہے۔ اسی طرح عربی میں بھی اس کے مختلف مفہوم ہوتے ہیں...... یہاں صرف اتنی بات یاد رکھئے کہ استفہام کا ایک بلیغ موقع استعمال وہ بھی ہے جب مخاطب سے کسی ایسی بات کا اقرار کرانا ہو جس کی نوعیت ہو تو ایک بدیہی حقیقت لیکن مخاطب اسے تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اس سے منحرف ہو۔"(۱۳)

مبالغہ فی النفی: نفی میں مبالغہ کا اسلوب عربی ادب میں معروف ہے۔ قرآن میں بھی جابجا اس اسلوب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ سورہ الانفال کی آیت :۵۱
وان اللہ لیس بظلام للعبید کی تشریح کرتے ہوئے مولانا اصلاحی لکھتے ہیں :

"لیس بظلام للعبید ۔ میں بھی عربی زبان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ عربی میں مبالغہ پر جب نفی آتی ہے تو اس سے مبالغہ فی النفی کا مضمون پیدا ہوتا ہے۔ یعنی خدا بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ امرؤالقیس نے لیس بفعال اور لیس بقتال کے قسم کی ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ یعنی فلاں میں کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں فلاں میں لڑنے کا ذرا دم خم نہیں۔"(۱۴)

اس خیال کی مزید وضاحت مولانا اصلاحی نے سورہ ق کی آیت :۲۹ وما انا بظلام للعبید کے ضمن میں کی ہے، وہ دیگر مفسرین پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ہمارے مفسرین اور مترجمین عام طور پر اس اسلوب سے چونکہ ناواقف ہیں اس وجہ سے وہ اس کو لیس بظالم کے معنی میں لیتے ہیں اور مترجمین اپنے ترجموں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہی کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ الفاظ قرآن سے صریح بے پروائی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر مقصود یہی کہنا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظالم نہیں ہے تو زبان کا سادہ اسلوب چھوڑ کر اس مطلب کے ادا کرنے کے لیے لیس بظلام کا اسلوب کیوں اختیار کیا جاتا؟ قرآن میں ہر لفظ اور ہر اسلوب کا ایک خاص مقام ہے جس کو اچھی طرح سمجھے بغیر آیت کی صحیح تاویل ممکن نہیں۔"(۱۵)

نفی الشی بنفی لازمہ: قرآن کریم میں عربی زبان و ادب کے ایک خاص اسلوب کی رعایت ملتی ہے یعنی کسی چیز کے لازم کی نفی کر کے نفس شی کی نفی کرنا۔ مولانا اصلاحی سورہ یونس کی آیت :۱۸ قل اتنبئون اللہ بما لا یعلم فی السموات ولا فی الارض کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "یہ نفی الشی بنفی لازمہ کے اسلوب پر ان فرضی سفارشیوں کی تردید ہے،.........بعینہٖ یہی مضمون رعد آیت :۳۳ میں بھی ہے۔ وجعلوا للہ شرکاء ۔ قل سموھم ام تنبئونہ بما لا یعلم فی الارض ام بظاھر من القول (اور انھوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے ہیں ان سے کہو ذرا ان کے نام تو لو، کیا تم اس کو ایسی چیز کا پتہ دے رہے ہو جس کے زمین میں وجود کا اس کو خود علم نہیں یا یونہی ہوائی بات کر رہے ہو) عربیت کے اسلوب کی مثالیں کلام عرب میں موجود ہیں، امراء القیس نے ایک صحرائی راستہ کی تعریف کی ہے کہ "لا یھتدی بمنارۃ" اس کی برجیوں سے رہنمائی نہیں حاصل کی جاتی، جس کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اس میں برجیاں اور ستارے سرے سے موجو ہی نہیں ہیں اگر ہوتے تو لازماً ان سے رہنمائی حاصل کی جاتی۔"(۱۶)

جملہ معترضہ : قرآن انسانوں کی ہدایت، اصلاح اور انقلاب حال کی کتاب ہے، اس کا رنگ و آہنگ خطاب کا ہے۔ مخاطب کی نفسیات، مسائل، اعتراضات اندیشوں اور امکانات سے وہ تعرض کرتا ہے۔ اس لیے اس کے اسلوب کلام میں ان چیزوں کی پوری رعایت ہوتی ہے۔ سلسلہ کلام میں اگر برسر موقع کوئی بات آجاتی ہے تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہاں اسے بیان کر دیا جاتا ہے پھر سلسلہ کلام جڑ جاتا ہے۔ عربی زبان و ادب میں یہ اسلوب معروف ہے، صاحب تدبر قرآن نے ان مقامات کی تفہیم و تشریح کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے جہاں یہ جملہ معترضہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً سورہ النساء کی آیت : ۱۵۵

فبما نقضهم میثاقهم و کفرهم بآیات اللّٰہ وقتلهم الانبیاء بغیر حق وقولهم قلوبنا غلف بل طبع اللّٰہ علیها بکفرهم فلایومنون الا قلیلا۔ کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

> "بل طبع اللّٰہ علیها جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتا ہے...... اس پورے رکوع میں بلاغت کا یہ اسلوب قابل توجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے جرائم کی ایک طویل فہرست تو سنادی گئی ہے۔ لیکن الفاظ میں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اس فہرست کے سنانے سے مدعا کیا ہے، جرائم کی فہرست کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ آگیا ہے اور اس کے ختم ہوتے ہی پھر ان کے جرائم کے بیان کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اقتضائے کلام سے ایک اور طویل جملہ معترضہ آگیا ہے اور اس کے بند ہوتے ہی پھر فہرست جرائم شروع ہو گئی ہے۔ یہ اسلوب بیان جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا متکلم کے زور بیان اور جوش، سامع کی ذہانت اور ہوش، دعوے کی قوت اور وضاحت اور فیصلہ کے مستغنی عن البیان ہونے کو ظاہر کرتا ہے، خطبائے عرب کے خطبات میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ قرآن میں بھی آگے اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اس طرح کے پر زور کلام کو ایک صاحب ذوق سامع سمجھ تو سکتا ہے لیکن اس کے زور اور اس کی بلاغت کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔" (۱۷)

سورہ آل عمران کی آیت : ۷۳ ولا تومنوا الالمن تبع دینکم قل ان الھدیٰ ھدیٰ اللّٰہ کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے مولانا اصلاحی رقمطراز ہیں "اس آیت کی تشریح و تفسیر میں ہمارے ارباب تاویل کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ اس کی وجہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہے کہ اس میں اسلوب کی بعض مشکلیں ہیں..... اس میں پہلی سمجھنے کی چیز قل ان الھدی اللّٰہ کے ٹکڑے کا جملہ کے اندر مقام ہے، یہ ٹکڑا دراصل سلسلہ کلام کا جزو نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک جملہ معترضہ کی ہے، یعنی سلسلہ کلام کے بیچ میں مخاطب کی ایک غلط بات کی بر سر موقع تردید فرما دی گئی ہے۔ اصل سلسلہ کلام اس طرح ہے: ولا تومنوا الا لمن تبع دینکم ان یوتی احدٌ۔ الآیۃ۔(۱۸)

گریز: شاعری کا ایک اسلوب جو بالعموم قصیدوں میں اختیار کیا جاتا ہے گریز ہے، قرآن کریم میں بھی اس اسلوب کی جھلک مل جاتی ہے۔ صاحب تدبر قرآن نے ایسے بعض مقامات کی نشاندہی کی ہے جہاں گریز کا اسلوب پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سورہ المومنون کی آیت: ۲۳ کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

> "ولقد ارسلنا نوحا الی قومه فقال یاقوم اعبدو اللّٰہ ما لکم من الہ غیرہ افلا تتقون۔ یہاں ایک نہایت ہی حسین و بلیغ تخلیص ہے جس کو ہماری شاعری کی اصطلاح میں گریز کہتے ہیں۔ اوپر ربوبیت کے شواہد سے جزاوسزا پر جو استدلال کیا ہے وہ "وعلیھا وعلی الفلک تحملون" پر ختم ہوا ہے۔ اب آگے جب تاریخی شواہد کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے حضرت نوح کے واقعہ کو لیا جو تاریخی تقدم کے اعتبار سے بھی رسولوں کی سرگزشت کا سرنامہ ہے، اور خاص طور پر کشتی ہی کو ان کی اور ان کے ساتھیوں کی نجات کا اللّٰہ تعالیٰ نے ذریعہ بنایا، کشتی کے ذکر کے بعد اس کشتی والے واقعہ کا ذکر اس طرح آگیا ہے گویا بات میں بات پیدا ہو گئی ہے۔"(۱۹)

گریز کی ایک اور مثال صاحب تدبر قرآن نے سورہ النمل کی آیت: ۵۹ کی تفسیر میں بیان کی ہے۔(۲۰)

طنز و تعریض: قرآن کریم میں کفار و مشرکین اور اہل کتاب و منافقین سے تخاطب میں زجر و توبیخ کے ساتھ طنز و تعریض کا بھی اسلوب استعمال ہوا ہے۔ اس کی معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا اصلاحی رقم طراز ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"انبیا کے طریقہ کار اور خطاب واستدلال میں استدراج، مزاح، طنز، توریہ اور تدریج وغیرہ کے جو انداز کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ یہ سب انسانی فطرت کے مقتضیات پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر اسلوب کا ایک محل ہوتا ہے۔ اور ہر انداز اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ بسا اوقات ایک وقفہ جو بظاہر ٹھہراؤ ہوتا ہے، سفر کی ہزاروں منزلیں طے کرا دیتا ہے اور ایک دلآویز طنز جو بظاہر طنز ہوتا ہے ہزاروں حجتوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔"(۲۱)

سورہ الانبیاء کی آیت ۱۳: لاترکضوا وارجعو الی ماأترفتم فیه ومسکنکم لعلکم تسئلون کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ صورت حال کی تعبیر ہے یعنی خدا کی گرفت نے اپنی زبان حال سے ان سے کہا کہ اب کہاں بھاگتے ہو، اب بھاگو مت، بھاگنے کا وقت گذر گیا، خدا کی بخشی ہوئی جن رفاہیتوں میں اب تک عیش کرتے اور اپنے جن محلوں اور ایوانوں میں بیٹھ کر خدا کی آیات اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے رہے ہو ان میں جاؤ تاکہ تمہاری اچھی طرح مزاج پرسی ہو۔ لعلکم تسئلون یہاں طنز و تضحیک کے مفہوم میں ہے۔ طنز و تضحیک کا یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی ہے۔ سخت اظہار غضب کے مواقع میں ہم بھی بانداز طنز یوں کہتے ہیں کہ ٹھہرو ابھی میں تمہاری مزاج پرسی کرتا ہوں ابھی تمہاری خبر لیتا ہوں، ابھی پوچھتا ہوں۔"(۲۲)

تمثیل و تشبیہ: قرآن کریم میں دعوتی موضوعات مثلاً ہدایت وضلالت، اور مخاطب کے احوال مثلاً مومن وکافر کی حالت کو تشبیہ اور تمثیل دونوں پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ صاحب تدبر قرآن نے تمثیل و تشبیہ کی معنویت اور بلاغت پر کلام کیا ہے وہ ان دونوں میں فرق اور ان کے مواقع استعمال بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تمثیل اگرچہ تشبیہ ہی کی نوعیت کی ایک چیز ہے لیکن تشبیہ اور تمثیل میں بڑا فرق ہے۔ ایک عام تشبیہ میں اصل نگاہ مشبہ اور مشبہ بہ پر ہوتی ہے۔ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان دونوں کے اجزا کو الگ الگ ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کے دیکھا جاتا ہے کہ ان میں باہم دگر کتنی مشابہت و مطابقت پائی جاتی ہے۔ اور پھر اسی مطابقت و مشابہت کے لحاظ سے اس تشبیہ کا حسن و قبح متعین ہوتا ہے، لیکن تمثیل میں اجزا کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں صورت واقعہ کو صورت واقعہ سے تشبیہ دی جاتی ہے، اگر ایک صورت حال اور دوسری صورت حال میں پوری پوری مطابقت موجود ہے اور تمثیل صورت حال کی پوری تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کر رہی ہے تو وہ تمثیل مکمل ہے۔ اگرچہ تشبیہ کے وہ تمام ضوابط اس پر منطبق نہ ہو رہے ہوں جو ایک تشبیہ کے مکمل ہونے کے لیے اہل فن نے ضروری قرار دیے ہیں۔"(۲۳)

اسم و فعل کے مواقع استعمال : عربی زبان میں بالعموم اسم دوام و استمرار اور فعل بے ثباتی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مگر صاحب تدبر قرآن نے اسم و فعل کے بعض اور خواص کی طرف اشارہ کیا ہے اور قرآنی آیات کے مفہوم کی نئی معنویت تلاش کی ہے۔ چنانچہ سورہ الحج کی آیت : ۱۷ ان الذین آمنوا والذین ھادوا والصابئن والنصاری والمجوس والذین اشرکوا، کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"آیت میں مختلف گروہوں کے ذکر کے لیے جو اسلوب بیان اختیار فرمایا گیا ہے وہ بھی قابل توجہ ہے، مسلمانوں اور یہود و مشرکین کا ذکر تو فعل کی شکل میں ہوا ہے، اور صائبین، نصاریٰ اور مجوس کا اسم کی شکل میں، اس کی وجہ یہ ہے کہ عملاً اس میدان میں ایک طرف مسلمان تھے، دوسری طرف مشرکین اور یہود ۔ یہود مشرکین کی حمایت اور اسلام کی مخالفت میں اپنے حسد و عناد کے باعث بہت سرگرم تھے، باقی فرقوں کی ہمدردیاں اگرچہ تھیں تو مشرکین ہی کے ساتھ لیکن وہ کچھ زیادہ سرگرم نہ تھے، اس لیے معرکہ کے اصلی حریفوں کو تو فعل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور دوسروں کا ذکر اسم کے ساتھ۔ زبان کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ فعل کے اندر ایک قسم کی سرگرمی کا مفہوم پایا جاتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے جبکہ اسم بالعموم صرف علامت امتیاز کا فائدہ دیتا ہے۔"(۲۴)

اسم و فعل کے استعمال کے دوسرے فوائد بھی ہیں، مولانا اصلاحی نے بعض دوسرے موقعوں پر ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً سورہ الانعام کی آیت : ۹۵ "یخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی" کی تفسیر کے ضمن میں لکھا ہے :

"یہاں زبان کا ایک نکتہ بھی قابل لحاظ ہے، پہلے تو فرمایا یخرج الحی من المیت لیکن دوسرے ٹکڑے میں اسلوب بدل کر فرمایا مخرج المیت من الحی مردہ سے زندہ کو نکالنے کے لیے فعل استعمال فرمایا جو صرف تصویر حال کا فائدہ دیتا ہے۔ لیکن زندہ سے مردہ کو برآمد کرنے کے لیے فاعل کا صیغہ استعمال فرمایا جس کے اندر عزم اور فیصلہ کا مفہوم بھی مضمر ہوتا ہے۔"(۲۵)

اسی طرح سورہ النساء کی آیت : ۱۳۵ یا ایھا الذین آمنوا آمِنوا کی تفسیر کرتے ہوئے فعل کے ایک اور استعمال کی طرف یوں اشارہ کیا ہے

"فعل اپنے ابتدائی اور ظاہری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اپنے حقیقی اور کامل معنی میں بھی، یہاں مسلمان من حیث الجماعت مخاطب ہیں جن میں خام و پختہ، ناقص و کامل اور مخلص و منافق ہر قسم کے عناصر شامل تھے۔"(۲۶)

ضمیروں کا استعمال : عربی زبان میں ضمیروں کا استعمال ایسے اسم کی طرف کیا جاتا ہے جو پہلے گذر چکا ہوتا ہے اور ضمیر گویا اسم کا قائم مقام ہوتی ہے، اگر کسی جملہ میں متعدد ضمیریں ہوں تو ان کا مرجع متعین ہوتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ضمیر کا مرجع کچھ ہو اور دوسرے کا کچھ اور الا یہ کہ کوئی مضبوط دلیل یا قرینہ اس کے لیے موجود ہو، مولانا اصلاحی نے قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے متعدد مواقع پر ضمیروں کے مراجع کی تعین میں فکر و اجتہاد سے کام لیا ہے۔ مثلاً سورہ الشعراء کی آیت : ۵۹ کذلك اورثناھا بنی اسرائیل کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"اورثناھا بنی اسرائیل میں ضمیر مفعول سے مراد بعینہ وہی نعمتیں نہیں ہیں جن سے قبطیوں کو اللہ تعالیٰ نے نکالا بلکہ اسی نوع کی وہ نعمتیں ہیں جو بنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسرائیل کو مصر سے نکلنے کے بعد سرزمین فلسطین میں حاصل ہوئیں...... ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ ہم نے ضمیر کا مرجع متعین کرنے میں یہاں تکلف سے کام لیا ہے۔ آیت کا ظاہر مفہوم تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن باغوں چشموں اور خزانوں سے اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو بے دخل کیا انہی کا وارث بنی اسرائیل کو بنایا لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ اعلی عربی میں ضمیریں اس طرح بھی آتی ہیں۔"(۲۷)

مولانا اصلاحی نے اس سلسلہ میں سورہ المائدہ کی آیت : ۱۰۲ قد سالها قوم من قبلکم سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں ضمیر کا مرجع جن سوالات کی طرف ہے بعینہ وہی سوالات بنی اسرائیل نے نہیں کیے تھے بلکہ اسی قبیل کے سوالات کیے تھے۔"(۲۸)

سورہ طہٰ کی آیت :۱۶ افلا یصدنک عنها من لا یومن بها کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

"عنها میں ضمیر کا مرجع ہمارے نزدیک صلوۃ ہے اور بها کی ضمیر کا مرجع الساعۃ ہے، یعنی نماز سے تمہیں وہ شخص روکنے یا غافل کرنے نہ پاوے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں کا پیرو ہے۔ یہ مفہوم لینے میں اگرچہ بظاہر انتشار ضمیر کا سوال پیدا ہوتا ہے جس کو کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے لیکن انتشار ضمیر صرف اس صورت میں عیب ہے جب مرجع کے تعین کے لیے کوئی واضح قرینہ موجود نہ ہو، اگر واضح قرینہ موجود ہو تو یہ کوئی عیب نہیں۔ بلکہ اس سے کلام میں ایجاز کا حسن پیدا ہوتا ہے۔ اور فصحا کے کلام میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں موجود ہیں۔"(۲۹)

بعض الفاظ و حروف کے مواقع استعمال : قرآن میں بعض الفاظ اور حروف خاص مواقع پر استعمال کیے گئے ہیں عام طور پر ان کی حکمت اور معنویت پر ہماری نظر نہیں پڑتی۔ مولانا اصلاحی نے ایسے الفاظ کو بھی تشریح و تحقیق کا موضوع بنایا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ ان کی تفسیر سے کلام الٰہی کا حسن اور نکھر تا ہے اور بات کی موزونیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر "ماکان" کا استعمال قرآن میں بار ہا کیا گیا ہے۔ مولانا اصلاحی اس کی گرہ کھولتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ماكان لنبي ان يكون له اسرى حتى يثخن في الارض، ماکان کا اسلوب بیان الزام اور رفع الزام دونوں کے لیے آسکتا ہے اور قرآن میں دونوں ہی قسم کے مواقع میں یہ اسلوب استعمال ہوا ہے۔ اس امر کا تعین کہ یہ الزام کے لیے ہے یا رفع الزام کے لیے، موقع و محل، سیاق و سباق، قرینہ اور مخاطب کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ بعینہ یہی اسلوب بیان آل عمران : ۱۶۱ میں ہے۔ وما كان لنبي ان يغل ومن يغلل يات بما غل يوم القيمة۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت الزام کے لیے نہیں بلکہ رفع الزام اور نبیؐ کی تنزیہہ شان کے لیے ہے...... ٹھیک اسی اسلوب پر آیت زیر بحث میں قریش کی تردید کی گئی ہے۔"(۳۰)

اسی طرح "الم تر" کا استعمال بھی قرآن میں جگہ جگہ کیا گیا ہے، مولانا اصلاحی اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے حوالہ سے اس کی معنویت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں :

" الم تر کا خطاب ضروری نہیں کہ واحد کے لیے ہو، بلکہ عموماً جیسا کہ استاذ امام نے سورہ فیل کی تفسیر میں واضح کیا ہے جمع کے لیے آتا ہے اور خطاب اس میں گویا مخاطب گروہ کے ہر شخص سے فرداً فرداً ہوتا ہے، اس کے بعد جس واقعہ کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ یا تو مخاطب گروہ کا عینی مشاہدہ ہوتا ہے، یا واقعہ کی شہرت اس درجہ کی ہوتی ہے کہ اس کی نسبت یہ باور کیا جاتا ہے کہ اس سے مخاطب باخبر ہیں یا انہیں باخبر ہونا چاہئے یا متکلم کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ واقعہ کی صداقت ایسی مسلم ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔"(۳۱)

لفظ "سبحنك" بھی قرآن میں متعدد بار اللہ کی صفات اور تنزیہ شان کے لیے استعمال ہوا ہے ان کے مواقع استعمال پر مولانا اصلاحی نے گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"قرآن مجید میں یہ کلمہ مختلف مواقع پر استعمال ہوا ہے، نامناسب اور خلاف شان باتوں سے اللہ کی تنزیہ کے لیے مثلاً سبحان اللّٰہ و تعالی عما یشرکون (قصص : ۶۸)

دعا کے موقع کے لیے مثلاً دعواھم فیھا سبحنك اللھم (یونس : ۱۰)

امر کے معنی کیلئے مثلاً فسبحن اللّٰہ حین تمسون و حین تسبحون (روم : ۱۷)

تعجب کے ساتھ کسی چیز کے انکار کے لیے مثلاً سبحنك ھذا بھتان عظیم (نور : ۱۷)(۳۲)

حرف "اذ" بھی قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے بلکہ بعض آیات کا آغاز ہی اس حرف سے ہوتا ہے مولانا اصلاحی اس کی حکمت بیان کرتے ہیں :

"عربی زبان میں جب کلام کا آغاز اذ سے ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس سے پہلے خیال کرو، تصور کرو، یاد کرو، یا ان کے ہم معنی کوئی فعل یہاں محذوف ہے، عموماً اس کے بعد کسی ایسی ہی سرگذشت یا واقعہ کا حوالہ آتا ہے جو یا تو مخاطب کے علم میں ہو یا خود متکلم اس کی قطعیت پر اس درجہ مطمئن ہو کہ ایک معلوم و معروف حقیقت کی حیثیت سے اس کا حوالہ دے سکے۔"(۳۳)

حروف زائدہ : قرآن کریم میں بعض حروف ایسے استعمال ہوئے ہیں جن کے معانی وہاں کچھ نہیں، بعض مفسرین ان کو زائد قرار دیتے ہیں۔ جو صرف حسن کلام میں اضافہ کی خاطر لائے گئے ہیں۔ مثلا حرف "لا" جو کبھی قسم کے پہلے آتا ہے اور کبھی مثبت مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ قدیم مفسرین میں ابن کثیر اور جدید مفسرین میں عائشہ عبدالرحمان بنت الشاطی قرآن میں زائد حروف کے استعمال کو تسلیم نہیں کرتے۔ مولانا اصلاحی بھی اسی نقطہ نظر کے حامی ہیں۔ چنانچہ سورہ الحدید کی آیت : ۲۹ لئلا یعلم اھل الکتاب کی تفسیر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

"حرف لا یہاں نہ زائد ہے اور نہ قرآن میں اس کے زائد ہونے کی کوئی مثال موجود ہے، بلکہ جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ ان

© rasailojaraid.com